تاریخِ اُردو ادب کیسے لکھی جائے؟

ڈاکٹر شگفتہ حسین*

Abstract:

The present study is concerned with the methodological and philosophical problems in the documentation of history of literature. It aims to distinguish between historiography and historical developmental approach. Historiography is a systematic record of different events and here historian is more interested in the past for the sake of past, where as in the historical developmental approach past is interpreted in the light of present or future. It also takes into accoutn the social, economic and political conditions of an era and how it is affecting the present.

ہم ماضی کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہ اندھا کنواں یا بلیک ہول (قعرِ ظلمات) ہے جو ہر گزرتے لمحے کو نگلتا جا رہا ہے۔ ہمارے نزدیک ماضی کی بہت اہمیت ہے اس لیے کہ یہ ہماری شناخت کا بنیادی حوالہ ہے بقول گوئٹے، ہم سب ماضی کے سہارے زندہ رہتے ہیں اور اس ماضی کی وجہ سے تباہ ہوتے ہیں۔ اِس ماضی کو طرح طرح سے محفوظ کرنے کے جتن صدیوں سے ہو رہے ہیں کیونکہ:

"This past is certainly distinct from all others in terms of its character and of the procedure in which it may be assembled and it has perhaps an obvious claim to be recognized as a uniquely "historical past."(۱)

* صدرِ شعبۂ اُردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین کچہری روڈ، ملتان

تاریخ، ہسٹری یا Istoria کے معنی تقریباً ایک سے ہیں لیکن جرمن لفظ Geschichte (گیشے) سہ معنوی ہے یعنی (i) وہ سب جو وقوع پذیر ہو چکا (ii) اسے جاننے کا طریقہ اور پھر (iii) اِس وقوع پذیر کو بیان کرنے کا طریقہ ـــــ لفظ تاریخ کو عام طور پر دو طرح سے لیا جاتا ہے ایک یہ کہ وہ سب کچھ جو ہماری قومی زندگی میں ایک مخصوص جگہ اور مخصوص وقت میں رونما ہوا، دوسرا کسی معینہ امر کے بارے میں تحقیق کرنا یا کسی ایک وقت میں رونما ہونے والے کچھ معینہ واقعات کے بارے میں آگہی دینا اور ایک مؤرخ کا ان سے نتائج برآمد کرنا ـــــ جب ہم ادبی تاریخ نویسی کی بات کرتے ہیں تو ہم لفظ تاریخ کے یہی دوسرے معنی لیتے ہیں۔ یہاں تاریخ وہ لوگ مرتب نہیں کر رہے جن کے کارناموں یا الفاظ کے بارے میں تحقیق و تفتیش کی جا رہی ہے بلکہ تاریخ وہ عناصر مرتب کر رہے ہیں جو تاریخ میں بنیادی تبدیلیاں لاتے اور تاریخ کے عمل کو متاثر کرتے ہیں۔ اِس لیے کہ تاریخی عمل جب آگے بڑھتا ہے، حالات اور واقعات میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو اشخاص کے نظریات اور خیالات میں بھی تبدیلی کا عمل واقع ہوتا ہے۔ نئے حالات نئی شخصیتوں کو تاریخ کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

تاریخ کسی عہد کی مرتب کرنا ہو یا زبان و ادب کی ـــــ اس کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے، ایک Mode of enquiry اور دوسرا Historical understanding کی۔ عام طور پر تاریخ ادب کا Mode of enquiry یا پیراڈائم یہ رہا ہے کہ صرف لوگوں کا تذکرہ کر دیا جائے، جیسے ہمارے ہاں اُردو شعراء کے تذکرے تحریر کیے جاتے رہے لیکن ان تذکروں کو بھی ہم یکسر نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہ دراصل History for the sake of history ہیں۔ دوسرا پیراڈائم جسے جدید طریقہ کار کہا جا سکتا ہے وہ ہے Historical development approach۔ کسی بھی ادبی تاریخ کو تالیف کرتے وقت مؤلف کو دوسرے جدید طریقہ کار سے کام لینا چاہیے کیونکہ یہی وہ طریقہ کار ہے جس کے ذریعے وہ اپنے قارئین کو نظریات و خیالات کے ارتقا کا شعور بخش سکتا ہے۔ ادب جس عہد میں بھی سانس لے رہا ہو اسے اندرونی و بیرونی عوامل ضرور متاثر کرتے ہیں۔ یہ عوامل لسانی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ گلوبل ولیج کی اصطلاح اب عام ہوئی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ماضی بعید میں بھی اندرونی کے ساتھ ساتھ بیرونی عوامل کی مداخلت ہوتی رہتی تھی اور اس مداخلت کے اثرات ہماری زندگی کے ہر شعبے پر پڑتے تھے۔ اگر کوئی مؤلف صرف اپنی ذاتی پسند ناپسند کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چند شخصیتوں کا نقشہ کھینچ دیتا ہے یا قدیم تذکرہ نگاروں کی طرح صرف ادبی کارناموں کی تفصیل بیان کر دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے وہ عصری شعور سے بے بہرہ ہے۔ ایک عہد کے اندر ایک خاص وقت میں خاص طرح کے نظریات کا ارتقا یا تبدیلی بہر حال ہمیشہ رونما ہوتی رہتی ہے اور اس تبدیلی کا منبع ہمیشہ ایسی قوتیں

ہوتی ہیں جو اس قدر طاقت ور ہوتی ہیں کہ شخصیتیں اور ان کے نظریات و خیالات ان کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ادبی تاریخ کا مؤلف جس معینہ عہد اور متعین جگہ کے بارے میں قارئین کو معلومات فراہم کر رہا ہو، ضروری ہے کہ وہ نظریات و خیالات میں ہونے والی تبدیلیوں کے سسٹم کی بھی نشان دہی کرے۔ مثلاً وہ کون سے غیر ادبی عوامل تھے جنہوں نے ہمارے ادب میں ایہام گوئی یا ریختی یا معاملہ بندی یا محاورہ بندی کے غالب رجحان کو فروغ دیا۔ ہمارے طالب علم جس لمحے ادبی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں یا امتحان کی تیاری کے عمل سے گزرتے ہیں تو کوئی ادبی تاریخ انہیں یہ نہیں بتاتی کہ ریختی کے وجود میں آنے کی اصل وجوہ کیا تھیں؟ بہت ممکن ہے کہ انہیں عورتوں کی ہم جنس پرستی کی باتیں سن کر نفرت اور کراہیت کا احساس تو ہو لیکن انہیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ آخر مرد حضرات کے عورتوں کی طرح ستاروں والی اوڑھنی اوڑھ کر لڑلڑ کر غزلیں پڑھنے اور زنانہ تخلص اپنانے کے پیچھے کون سے نفسیاتی یا معاشرتی عوامل کارفرما تھے۔ اس صورتِ حال سے آگاہی دینا کہ معاشرہ ان تبدیلیوں کا شکار کیوں ہو رہا تھا۔ ادبی تاریخ کے مؤلف کا کام ہے۔ درست ہے کہ ’’تاریخ انسانی زندگی کے تمام حقائق کے نہیں بلکہ صرف بعض حقائق سے تعلق رکھتی ہے۔‘‘(۲) لیکن کسی بھی مؤلف کے لیے عصری شعور بہت ضروری ہے۔ صرف گزرے واقعات کو تحریر کر دینا کوئی معرکہ نہیں، ماضی کو حال سے relate کرنا مؤلف کی عظیم ذمہ داری ہے۔ اس لیے کہ انسان ماضی کی تاریخ کو بھی حال کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کا تخلیقی ادب اس امر کا عکاس ہے کہ اس معاشرے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاط عام تھا، اسی طرح واجد علی شاہ کی رنگینوں اور ’’چھٹی نہانے‘‘ کی کہانیاں زبان زدِ عام ہیں لیکن وہ شخص شعر، ڈرامہ اور رقص پر مکمل عبور رکھتا تھا وہ اُردو ادب کا پہلا ڈرامہ نگار ہے جس نے ’’رادھا کنہیا کا قصہ‘‘ تحریر کیا۔ اِس کا دور ریاستی اور سیاسی زوال کا دور تھا لیکن ادبی اور تہذیبی اعتبار سے شاندار دور تھا۔ یہی صورتِ حال غالب اور مومن کے دور کی ہے کہ سیاسی اعتبار سے زوال کی حدوں کو چھو رہا تھا لیکن تہذیبی و ادبی اعتبار سے یہ آج بھی ہماری حسیات کو مدہوش کرتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ادبی تاریخ کا مؤلف ہمیں ان تضادات کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ چلیئے کوشش نہیں کرتا تو نہ سہی ___ جواب نہ دے ___ سوال تو اُٹھائے کہ بیجاپور اور گولکنڈہ والے ہندو اور مسلمان کا فرق کیوں بھلائے بیٹھے تھے ___ وہ معاشرہ اتنا روادار یا Tolerant کیسے تھا ___ ریختی کا شور تھا یا انشا اور جرأت کی دھوم تھی تو لوگ فحش سے فحش باتوں کو کیسے برداشت کر لیتے تھے ___ وہ کون سا تہذیبی رکھ رکھاؤ یا رواداری تھی جو انہیں ان سب باتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بخشتی تھی اور اب ہم کیوں بات بہ بات بھڑک اُٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کے گھروں پر سرخ نشان لگا کر خوشی محسوس کرتے ہیں اور اگر حقیقت اس کے برعکس تھی اور ماضی میں بھی تنگ نظری کا یہی عالم تھا یونہی کفر کے فتوے دیئے جاتے تھے تو پھر ان کی بھی نشان

دہی کی جائے تاکہ ہم ماضی کو شاندار اور اپنے عہد کو کم حوصلہ نہ جانیں۔ مؤلف بے شک واجد علی شاہ کی تمام خوبیوں کا احاطہ نہ کرے لیکن کم از کم طالب علموں کے ذہنوں میں سوال جگا دے تاکہ وہ فن کار واجد علی شاہ کو تلاش کرنے کی کوشش کریں، غالب اور مومن کے دور کے تضاد کو حل کرنے کا بیڑا اُٹھائیں لیکن ہوتا یہی ہے کہ مؤلفین صرف ادبی تاریخ کی تمام یادگاروں کو سنین کی بھرمار کے ساتھ محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں اِس طرح ادبی تاریخ ادھوری اور یک رخی معلومات فراہم کرتی ہے جبکہ اس کا صحیح منصب یہ ہے کہ ماضی کے حوادث و واقعات کی تہوں میں جو وجوہات کارفرما ہیں ان کو دریافت کرے اور انہیں زمانہ حال سے جوڑے اور اس کی معنویت واضح کرے۔ دراصل ادب کے بارے میں بھی دو آرا پائی جاتی ہیں ___ Art as a divine gift اور Art as human activity ___ ممکن ہے ادبی تاریخ کے مؤلفین آرٹ کو آسمانی اور الوہی چیز سمجھتے ہوں لیکن حقیقت میں آرٹ Human activity ہے ___ جمالیات کے ساتھ ساتھ اس کا انسانوں کی بہتری سے بھی تعلق ہے۔ ادب نہ صرف انسانی اقدار کو جنم دیتا ہے انہیں فروغ بھی دیتا ہے، ارتقاء بھی بخشتا ہے۔ بقول ہڈسن:

> "A nation's literature is not a miscellaneous collection of books which happen to have been written in the same tongue or within a certain geographical area. It is the progressive revelation, age by age, of such nation's mind and character."(۳)

ادبی تاریخ کو محض انفرادی تاثر دینے کی بجائے اجتماعی جوش پیدا کرنا چاہیے۔ مادیت پرستی کے اِس دور میں وہی علم قبولیت عام کا درجہ پاتا ہے جو اجتماعی افادیت کا حامل ہو۔ یہ درست ہے کہ ادبی تاریخ کا تعلق ادب سے ہے لیکن تاریخ نویسی کے جدید سائنسی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بقول ڈاکٹر مبارک علی جو بھی تاریخ عوام کے سماجی حالات سے مربوط نہیں وہ تاریخ نہیں کیونکہ کسی بھی معاشرے کے لیے ماضی کا تجربہ نئے آئینہ کی مانند ہوتا ہے کہ جس میں وہ اپنی رفتار اور عمل کو دیکھ سکتا ہے۔(۴) جہاں تک سنین کا تعلق ہے اگر یہ اِس لیے ضروری ہیں کہ ان سے تحقیق اور تفہیم میں فرق پڑتا ہے تو ٹھیک لیکن طالب علموں پر یاد کرنے کی بندش ضرور ہٹا دیں۔

دراصل ادبی تاریخ ایک طرح سے داستان سرائی ہے لیکن یہ خود ساختہ داستان نہیں یہ بیان کا فن ہے جس سے دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تالیف کردہ ادبی تاریخ کا لہجہ پسند ہے۔ واقعات کو ہنرمندی سے انتخاب کرنا، انہیں ایک مناسب ترتیب سے پھیلانا، معقولیت کی رہنمائی کرنا اور بے تحاشا اسم صفات سے بچ کر چلنا ہی مؤلف کا فنی کمال ہے۔

مؤلف محقق اور نقاد کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ اِس کے لیے سب سے زیادہ اہمیت ماخذات کی ہوتی ہے۔ یہ ماخذ ادبی اور غیر ادبی دونوں ہو سکتے ہیں۔ ان کے بارے میں محتاط رویہ اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ:

> ''تاریخ کو محض ماخذوں کی شہادت کی بنیاد پر نہیں بیان کرنا چاہیے بلکہ ان ماخذوں کے ساتھ ساتھ اسے سرکاری دستاویزات، کاغذات، خط و کتابت، فرامین، حکم ناموں اور ذاتی یادداشتوں کو بھی استعمال کرنا چاہیے۔''(۵)

رشید حسن خان نے بھی اپنی تصنیف ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' میں تحقیق کے ساتھ ایسی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے جب محققین نے مآخذات کے ساتھ متن کی صحت کے ضمن میں بھی لاپرواہی برتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

> ''تاریخ ادب کی کتابیں، لغات، انتخابات، نصابی کتابیں؛ ان کتابوں میں اور ان جیسی کتابوں میں قدیم و جدید شاعروں کا کلام اور نثر کے اجزا محفوظ ہیں، چونکہ یہ معلوم ہے کہ ایسی بیش تر کتابوں میں نقل در نقل سے کام لیا گیا ہے اور یہ بھی ہے کہ عام طور پر ایسے مجموعوں میں بے احتیاطیوں کی کارفرمائی پائی جاتی ہے اور ان کے مرتبین نے تحقیق اور تدوین کے اُصولوں کی پابندی نہیں کی ہے، اس لیے صحت انتساب اور صحت متن کی حد تک ان کو معتبر مآخذ کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔ یوں بھی ایسی کتابوں کی حیثیت ثانوی مآخذ کی ہوا کرتی ہے (اگر اوّلین مآخذ موجود ہوں)۔''(۶)

تاریخ زبان کی ہو یا ادب کی، مؤلف کو تاریخ تالیف کرتے وقت جو دستاویز میسر ہوں ان کے بارے میں اطمینان کر لینا چاہیے کہ کیا یہ اپنی اصل صورت میں ہیں یا جب سے تحریر ہوئی ہیں آہستہ آہستہ خراب ہو رہی ہیں پھر قدیم دستاویزات کے ساتھ یہ مسئلہ بھی ہوتا ہے کہ جب ان کو نقل کیا جاتا ہے تو غلطیاں رقم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایسی صورت میں اصل مسودے کا ہونا ضروری ہے لیکن اکثر یہ حادثہ بھی ہوتا ہے کہ اصل مسودہ گم ہو جاتا ہے اور صرف ایک نقل باقی رہ جاتی ہے۔ غلطی سے بچنے کے لیے یہاں مؤلف کے لیے ضروری ہے کہ اسے زبان اور خط کے بارے میں خصوصی معلومات حاصل ہوں تاکہ وہ صحیح فیصلہ کر سکے۔ بعض دستاویزات مشکوک بھی ہو جاتی ہیں یا مؤلف اپنے تحقیقی جوش میں شک کا شکار ہو جاتا ہے تو ایسے میں اس کو چاہیے کہ وہ متن کے بارے میں واضح کر دے کہ اسے متن کیسا ملا تھا اور اس نے اس میں کیا تبدیلیاں کی ہیں؟ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی مسودے کی کئی ایک نقول مل جاتی ہیں لیکن اصل مسودہ نہیں ملتا تو پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا سبھی نقول میں ایک ہی جیسی غلطیاں پائی جاتی ہیں اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب ہے کہ یہ نقول ایک ہی ذریعے سے وجود میں آئی ہیں۔ یہاں پھر مؤلف کو مختلف روایتوں کا جائزہ

لینا چاہیے اور جس متن کے بارے میں سب راوی متفق ہوں اس کو اپنانا چاہیے، لیکن اس کا ذکر ضرور کرے۔ حوالوں کا سلسلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ کچھ حوالے قطعی غیر اہم (اپنے مصنف کی وجہ سے) کچھ مشکوک اور کچھ اسی قدر اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جن کے بارے میں ممکنہ حد تک کہا جا سکتا ہے کہ یہ قابلِ قبول ہیں۔ مؤلف کو حوالہ جات کا تقابل کر کے اس امر کا فیصلہ کرنا چاہیے کہ کون سا حوالہ اس وقت تک کی معلومات کے عین مطابق ہے۔ جہاں تک نقاد ہونے کے تعلق ہے تو آپ نقاد سے لاکھ غیر جانبداری کا تقاضہ کریں اس کا اپنا ایک نقطۂ نظر ضرور ہوتا ہے۔ مؤلف جب اس حیثیت سے کسی کے کلام کا نمونہ انتخاب کرتا ہے یا کسی کے بارے میں تنقیدی رائے دیتا ہے تو اس کی ذاتی پسند ناپسند ضرور مداخلت کرتی ہے۔ مثلاً ادبی تاریخوں میں ریختی اور رنگین کے باب میں اکثر ناگواری کا لہجہ اپنایا جاتا ہے، لیکن اس سے زبان کو کیا فائدہ پہنچا، یا نسوانی محاورہ نے اردو زبان میں کیا اضافہ کیا اور کیا یہ نسوانی محاورہ آئندہ مروّج بھی ہوا یا نہیں ___ اس کی نشان دہی نہیں کی جاتی۔ عام طور پر ایسا اس وقت ہوتا ہے جب مؤلف خود پر اخلاقیات اور فطانت کی دیانت کو طاری کر لیتا ہے اور اس کا انداز کسی واعظ کا سا ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی شخص کی شخصی خوبیوں میں اپنی طرف سے اضافہ کرے۔ رنگین بیانی سے کام لے، ڈرامائی تاثر پیدا کرے، جذباتی شدت کو مبالغے سے پیش کرے یا محض مخصوص لوگوں کو خوش کرنے کے لیے متعصّبانہ رویہ اختیار کرے۔

بہت ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حواشی اور تعلیقات ادبی تاریخ کے لیے ضروری نہیں ہیں اور صرف حوالہ درج کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ اگر حوالوں کے ساتھ ہی حواشی اور تعلیقات بھی تحریر کر دیئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن انداز ایسا نہ ہو جیسا ڈاکٹر جمیل جالبی کا ہے۔ مثلاً وہ حوالہ بھی دیتے ہیں اور حواشی بھی پھر فارسی کے اردو ترجمے کے لیے حواشی ب کے عنوان سے پھر حواشی تحریر کرتے ہیں۔(۷) اس سے قرأت کا تسلسل ٹوٹتا ہے اگر حواشی ب الگ سے تحریر کرنے کے بجائے ترجمہ پاورقی میں تحریر کر دیا جائے تو متن کی قرأت اور مفہوم سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ مغرب میں حوالہ کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ہاں البتہ تعلیقات تفصیل سے ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں باب کے آخر میں تحریر کر دیا جائے۔ ویسے بھی ڈاکٹر گیان چند کا خیال ہے کہ ''جالبی کے ذہن میں متن اور حاشیے کی تفریق واضح نہیں۔''(۸)

ادبی تاریخ مختلف قدیم دستاویزات کے تنقیدی تجزیے سے اخذ کردہ حقائق پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہاں اس امر کی گنجائش نہیں کہ گزرے وقت کو دوبارہ تخلیق کیا جائے یا تباہ کر دیا جائے۔ ادبی تاریخ ایک طرح سے موضوعی سائنس اور تاریخی عمل خالصتاً فکری عمل ہے جہاں مطلوبہ معلومات براہِ راست میسر نہیں آتیں اور مؤلف کی داخلیت

غائب شدہ حقائق کو مصور کرتی ہے، لیکن ایک اعتبار سے یہ معروضی عمل بھی ہے اس لیے مؤلف کو اپنی پسند ناپسند اپنے تعصّبات سبھی کو چھوڑنا ہوتا ہے۔ اسے کسی رنگ، نسل، مسلک، فلسفہ، نظریہ یا گروہ سے وابستہ نہیں ہونا چاہیے گو یہ ناممکن ہے، لیکن اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو کم از کم جانبداری کے الزام سے ضرور بچ سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ ادبی تاریخ نویسی ماضی کی ادبی سچائیوں کو جاننے اور آج کے عہد میں سانس لیتے ادب کی ابتدا اور ارتقاء کو بیان کرنے کا نام ہے۔ ان سچائیوں کو بیان کرنے کے لیے مؤلف بے شمار مآخذات اور معلومات کو بروئے کار لاتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ عصری شعور کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ قیاسی اور اکمل ذہن کا مالک ہو، تاکہ حقائق کو جاننے اور بیان کرنے کے اس سفر میں کسی غلطی کا احتمال نہ رہے۔

حوالہ جات

۱۔ Oakeshott, Michael, On History, and other essays, England: England, Basil Blackwell Publishers Limited, 1983, P.63.

۲۔ ٹائن بی، آرنلڈ جے (مؤلف) مطالعۂ تاریخ (حصہ اوّل) غلام رسول مہر (مترجم) لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۲۰۰۷ء، ص ۹۳۔

۳۔ Hudson, William Henry, An Introduction to the Study of Literature, Lahore: Allied Book Corporation, 1993, P.32.

۴۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور سیاست، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء

۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ شناسی، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۳ء

۶۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۸ء، ص ۱۸

۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد اوّل، دوم، سوم) لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۲۰۰۶ء

۸۔ گیان چند، ڈاکٹر، اُردو کی ادبی تاریخیں، لاہور: انجمن ترقیِ اُردو، ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۷۔

کتابیات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء

۲۔ ٹائن بی۔ آرنلڈ جے (مؤلف) مطالعۂ تاریخ (حصہ اوّل)، غلام رسول مہر (مترجم) لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۷ء

۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۴۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اُردو، مرزا محمد عسکری (مترجم) کراچی: غضنفر اکیڈمی پاکستان، س ن

۵۔ سعد مسعود غنی: ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادب اُردو، (حصہ اوّل) ملتان: المضر اب پبلشرز، ۲۰۰۵ء

۶۔ گیان چند، ڈاکٹر، اُردو کی ادبی تاریخیں، پاکستان: انجمن ترقیِ اُردو، ۲۰۰۰ء

۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ شناسی، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۳ء

۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور سیاست، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء

۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء

۱۰۔ Hudson, William Henry, An Introduction to the Study of Literature, Lahore: Allied Book Corporation, 1993.

۱۱۔ Oakeshott, Michael, On History and other essays, England: Basil Blackwell Publishers Limited, 1983.

❁❁❁